راشد الغنوشی

تیونس میں تحریکِ اسلامی

مترجم جناب پروفیسر آسی ضیائی صاحب

تیونس کی اسلام پسند تحریک کے معروف رہنما، راشد الغنوشی گذشتہ اگست کو (دس میں سے) تین سال قید کاٹ کر رہا ہوئے۔ انہیں یہ سزا بورقیبہ کی مخالفِ اسلام پالیسیوں کی مخالفت کرنے پر دی گئی تھی۔

یہاں اُن کا عبدالحبیب قسطنیرا سے ایک انٹرویو پیش کیا جارہا ہے، جس میں انہوں نے تحریکِ اسلامی میں اپنے تجربات بیان کیے ہیں اور شمالی افریقہ میں اس تحریک کے مستقبل پر اظہارِ خیال کیا ہے۔

• سوال: کیا آپ اپنی سرگزشت بتائیے گا اور یہ کہ اسلام کی راہ میں جدوجہد سے کیونکر وابستہ ہوئے؟

جواب: مَیں نے ثانوی تعلیم زیتونہ مدرسہ سے مکمل کی، جس کے بعد تیونسی حکومت نے وہ بند ہی کر دیا۔ یوں میرا تعلق آزادی کے ابتدائی سالوں والے طلبائے زیتونہ کی نسل سے ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ہم اپنے ہی ملک میں خود کو اجنبی محسوس کرتے تھے۔ ہماری تعلیم تو ہوئی تھی مسلمانوں اور عربوں جیسی، مگر ملک ہمیں مکمل طور پر فرانسیسی تہذیب میں غرق نظر آتا تھا۔ مزید تعلیم کے دروازے ہم پر بند تھے، کیوں کہ یونیورسٹی پوری طرح مغرب زدہ تھی۔ اُس زمانے میں جو عربی میں تعلیم جاری رکھنا چاہتے تھے انہیں مشرقِ وسطیٰ جانا پڑتا تھا۔ مَیں بھی انہی میں سے تھا جنہوں نے مشرقِ وسطیٰ میں اپنی پڑھائی مکمل کرنے کا فیصلہ

کیا۔ میں نے دمشق سے شعبۂ فلسفہ و ادب میں، باختصاصِ فلسفہ، میٹرک اور چار سال بعد گریجویشن کیا۔

۱۹۶۴ء میں جب میں نے یونیورسٹی میں پڑھنا شروع کیا تب میرا ملک عرب قومیت کی راہ پر چل رہا تھا، سو میں بھی کچھ مدت تک اس سے وابستہ رہا۔ اس میں سائنٹیفک سوشلزم شامل تھا جو مارکسزم سے بہت قریب تھا۔ چنانچہ یونیورسٹی کے ابتدائی سالوں میں میں بھی لادین ہو گیا تھا۔ البتہ اندر سے میں برابر مومن رہا۔ میں رمضان میں روزے کو رکھتا تھا مگر نماز اور دین کے دیگر تقاضے پورے نہ کرتا تھا۔

جیسا کہ ہم شمالی افریقہ کے لوگ سمجھتے ہیں، میں بھی ہمیشہ سمجھتا رہا کہ میرا عرب ہونا اور مسلمان ہونا غیر منفک حقائق ہیں۔ البتہ مشرق وسطی میں عرب عیسائی بھی ہوتے ہیں۔ اور مختلف غیر مسلم فرقوں والے بھی۔ وہاں عربیت کا تصور ہی بالعموم مخالفِ اسلام ہوتا ہے۔

عرب قومیت سے میرا لگاؤ زیادہ دیر نہ رہا۔ یونیورسٹی کے اندر جب میرا واسطہ دوسرے اسلام پسندوں سے پڑا جو نیشنلزم کے قائل نہ تھے تو میری ان سے بحث ہوئی، جس سے ترقی پسندانہ طور پر میرے ذہن پر سے نیشنلزم کی گرفت کمزور پڑتی گئی۔ کچھ عرصے بعد میں نے جان لیا کہ عرب نیشنلزم اسلام کے خلاف ہے۔ اگرچہ عربی جذبات و شناخت، جس میں میری تعلیم ہوئی تھی، اور اسلام ایک ہی بات ہے۔ اُن دنوں میں شام کی ناصری سوشلسٹ پارٹی کا ممبر تھا، مگر جب ایک دفعہ میں نے اس کا صحیح مطلب سمجھ لیا تو اُسے ترک کر دیا اور اسلام کو مکمل طور پر اختیار کر لیا اور ساتھ ہی مجھ میں یہ اُمنگ اُبھرتی گئی کہ ان تمام لادینی رجحانات کے ایک ایک مظہر سے جنگ کی جائے۔

پھر میں اعلیٰ تعلیم کے لیے فرانس چلا گیا، مگر خاندانی حالات کے باعث مجھے ایک ہی سال بعد واپس تیونس آنا پڑا۔ یہاں ایک ثانوی مدرسے میں میں نے استاذِ فلسفہ کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ تبھی سے میں نے نوعمروں میں اپنی اسلامی سرگرمیاں شروع کیں۔ یہ ۱۹۶۰ء کے عشرے کا اخیر زمانہ تھا۔

اس مدرسے میں ہم نے ایک پرانی مسجد کو، جو کچھ عرصے سے ویران پڑی تھی، آباد کرنے سے پہل کی۔ ابتدائی مدارج میں میں اپنی بیشتر مساعی اس کام کے لیے وقف رکھتا کہ عقلی استدلال سے اپنے طلبہ پر ہر مادّہ پرستانہ نظریے کی خامیاں اور تضادات واضح کر دوں۔ پھر میں اسلام کا نقطۂ نظر پیش

کرتا اور تمام دیگر مغربی ادیان پہ اُس کی برتری ثابت کرتا۔

ہمارا حقیقی کام دراصل ستر کے عشرے میں شروع ہوا، جب یہاں دارالحکومت میں نوجوانوں کا ایک چھوٹا سا گروپ بنا۔ اُن دنوں کوئی نوجوان، بالخصوص جب کہ وہ نام نہاد تعلیم یافتہ لوگوں میں سے بھی ہو، نماز پڑھتا بمشکل ہی ملتا تھا۔ رہیں لڑکیاں تو تقریباً ناممکن تھا کہ ان میں سے کوئی اسلامی لباس میں دکھائی دے جائے۔ اسی پہلے گروپ کے ممبروں میں سے عبد الفتاح مورو تھے۔

ہماری سرگرمیوں کے دو میدان تھے: ثانوی مدارس، جہاں ہم جلسے اور اجتماعات منعقد کراتے، اور مساجد، جہاں ہم اسلام کے متعلق درسوں کا اہتمام کرتے۔ کبھی کبھی ہم اسلام کی طرف لوگوں کو بلانے کے لیے سڑکوں پر بھی نکل آتے، جیسے (پاکستانی الاصل) تبلیغی جماعت کرتی ہے۔

سوال: کیا حکومت نے ان سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کی؟

جواب: اُس وقت کسی کو گمان بھی نہیں تھا کہ ایک اسلامی تحریک کو ایسے ماحول کے اندر کوئی کامیابی ہو پائے گی جو مادی قدروں سے چھلکا پڑ رہا ہو۔ جہاں ہر چیز حدودِ اسلام کی پامالی کی دعوت دیتی ہے۔ اس نظام نے نوجوانوں کو بے دین بنانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا ــــ مادہ پرستانہ رجحان نے انہیں نکما اور مسکین بنا ڈالا تھا۔ بہرحال جب اسلام پسندوں کی تعداد بڑھنے لگی، تب حکومت نے ہماری سرگرمیاں مفلوج کر دینے کی کوشش کی۔ اس پر ہم مجبور ہوئے کہ عمل کے اور طریقے سوچیں۔ چنانچہ ہم نے اپنی تزویر (اسٹریٹیجی) بدل کر طے کیا کہ اپنے گھروں ہی کے خفیہ میدانِ جنگ میں اپنی سرگرمیاں لے جائیں۔ ہم نے خود کو اسلام کی تعلیمات سے بہرہ ور کرنے کے لیے گروپ بنائے۔ ہر گروپ میں آٹھ دس برادر اور ایک نگران اور ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ تعلیم حفظِ قرآن، سنت اور دوسرے علومِ اسلامی کے مطالعے پر مشتمل ہوتی۔ ہم ایک چھوٹا سا اسلامی معاشرہ بن کر ایک دوسرے کو ہر اس بات میں مدد دیتے جو ہمیں اللہ سے قریب تر کرے۔ مثلاً ہم نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے باقاعدہ چندہ دینا رائج کیا۔

یہ چھوٹے چھوٹے گروپ بڑھتے بڑھتے پورے ملک پر محیط ہو گئے۔ اِدھر ثانوی مدارس کے طلبہ یونیورسٹی میں پہنچے اور وہاں اسلامیوں اور مارکسیوں میں باہم کشمکش شروع ہوئی۔ کچھ سالوں سے مارکسیوں کا طلبہ میں بڑا زور تھا۔ اور وہ ہم پر بقول اپنے "انقلابی تشدد" آزمانے سے بھی نہیں

چھپ سکتے تھے۔ اس صورتِ حال میں اسلام پسند بھی اپنے بچاؤ کی خاطر ایک سے زائد بار جوابی کارروائی کرنے پر مجبور ہوئے۔ دس سال کی مسلسل لڑائی کے بعد اسلام پسندوں نے یونیورسٹیوں میں طاقت پکڑی، اور آج طلبہ کی تمام تحریکوں میں طاقت ور ترین ملتے جاتے ہیں۔ اُدھر اس اثنا میں ہم تقریباً ہر ثانوی مدرسے میں مسجد بنوانے میں کامیاب ہو گئے۔

اپنی دعوت کو مزید بڑھانے کی غرض سے ہم مزدور یونینوں کے ذریعے مزدور دنیا میں داخل ہوئے۔ ہمارے ملک میں ایک روایت بہت قوی ہے۔ تیونیسیا کی مزدور تنظیم پورے براعظم افریقہ اور ساری عرب دنیا میں طاقت ور ترین ہے۔ پہلے پہل اس یونین (تیونسی محنت کشوں کی جنرل یونین یا "یو جی ٹی ٹی") پر دستور پارٹی یعنی حکومتی پارٹی کا عمل دخل تھا۔ پھر طویل جدوجہد کے بعد مارکسیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ عشرہ ۱۹۷۰ء کے آخری دنوں میں ملک میں عام ہڑتال ہوئی۔ محنت کشوں کو مملکت کی سیکورٹی افواج سے جا بھڑایا گیا جس میں بہت سی جانیں گئیں۔ اس بحران کے نتیجے میں یونین سے دستوری پارٹی کو خارج ہونا پڑا۔

ان تمام تشدد آمیز واقعات کے دوران میں ہم الگ تھلگ رہے، اور ان میں سے کسی میں ہم نے حصہ نہ لیا۔ ہماری کوئی یونین والی سرگرمی ہی نہ تھی، کیونکہ ہمارا ایک طرفہ فیصلہ یہ تھا کہ یونین بازی ہمارے شایانِ شان نہیں۔ امیر اور غریب کے مابین سماجی ٹکراؤ مارکسی کلیہ ہے جو ہمارے تصورِ زندگی سے میل نہیں کھاتا۔ بعد میں ہم نے جان لیا کہ اس کشمکش میں اسلام کے پاس بھی کچھ کہنے کو ہے اور یہ کہ بحیثیت مسلمان ہم اس سے لاتعلق نہیں رہ سکتے۔ اسلام مظلوم کی حمایت کرتا ہے۔

اپنے ملک میں ہم نے دیکھا کہ بین الاقوامی سرمایہ داری سے وابستہ گروپ عوام کا استحصال کرتا ہے اور اس سے سماجی رواداری، ہم آہنگی اور توازن ٹوٹ گیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام لوگوں کے مادی مراتب میں مکمل مساوات کا ڈھونگ نہیں رچاتا۔ کیونکہ یہ صریحاً محال ہے، مگر یہ بھی یقینی ہے کہ اسلامی معاشرے میں یہ روا نہیں کہ چند لوگوں کے پاس تو سب کچھ ہو اور باقی بھوکوں مریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "وہ مومن نہیں جو خود پیٹ بھر کر سوئے اور اس کو معلوم ہو کہ اس کا پڑوسی بھوکا ہے"۔ ایک اور مشہور حدیث میں آپ نے قبیلہ اشعریین کے ان اصحاب کی تعریف فرمائی کہ "جب ان کا رزق تھڑ جاتا ہے یا وہ غربت کا شکار ہو جاتے ہیں تو وہ اپنا سارا

ذخیرہ جمع کر کے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ میں اُن میں سے ہوں اور وہ میرے لوگ ہیں"۔

پھر ہمارا موقف بالکل واضح ہو گیا ـــــ ہم مظلوموں کے طرف دار تھے۔ اسی نکتے سے معاشرتی عقائق کا احساس اور ادراک ہم میں اُبھرنا شروع ہوا۔ اسلام پسندوں نے ٹریڈ یونین تحریکوں کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور آج وہ اس میدان میں ایک بڑی طاقتور جماعت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

عوام، خاص کر نوجوانوں، کا اسلام کو اس حد تک قبول کر لینا کہ کچھ مساجد میں اسلام کا درس سننے کے لیے کبھی کبھی ہزاروں اہل ایمان جمع ہو جاتے، ساتھ ہی ایرانی انقلاب کی مقبولیت اور وہ جوش و جذبہ جو نوجوانوں میں پیدا ہو گیا ـــــ یہ سب مل کر تیونیسیا کو انقلابی احیائے اسلام کی راہ پہ لے جانا، جس میں پُرانے نظام کی موت دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ تیونسی حکومت اس نئی تحریک کا قریب سے جائزہ لینے لگی۔ حکومت کے اندیشے اُس وقت نقطۂ عروج پر پہنچ گئے جب تحریک نے درخواست پیش کی کہ اسے قانوناً ایک سیاسی جماعت مان لیا جائے۔ حکومت کو معلوم ہے کہ ہماری تحریک بہت مقبول ہے اور اس کی جڑیں گہری ہیں اور اگر کبھی ہم نے الیکشن میں حصہ لیا تو فتح ہماری ہوگی۔ دوسری طرف باقی ہر جماعت حکومت کے قابو میں ہے۔ اور یہ خوب معلوم ہے کہ اُن سے کوئی حقیقی خطرہ نہیں ہے۔

ملک کے اندر اور باہر انہی حالات سے حکومت مجبور ہو گئی کہ بڑے پیمانے پر ہماری تحریک کو دبا دے۔ ۱۷ رمضان ۱۴۰۱ھ (جولائی ۱۹۸۱ء) کو ہمارے گروپ کے تمام جانے پہچانے رہنما ارکان، ہمدردوں بلکہ مشتبہ افراد سمیت گرفتار کر لیے گئے۔ ہم سب کو قید میں ڈال کر بعد میں مقدمہ چلایا گیا اور ۱۸ سال قید تک کی سخت سزائیں دی گئیں۔

سوال: تحریک کے ارکان کے خلاف الزامات کیا لگائے گئے؟

جواب: ہماری گرفتاری کا بہانہ یہ بنایا گیا کہ ہم ایک خفیہ تنظیم ہیں اور یہ کہ ہم نے سربراہ مملکت کی توہین کی۔ ہمارے دفاع کے لیے ۲۰۰ سے زائد قانون دانوں نے پیش کش کی ـــــ جن میں سے کچھ اسلام پسندانہ رجحان والے تھے اور کچھ دوسرے رجحان والے ـــــ بلکہ وہ تو اس الزام کے خلاف مظاہرہ کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ ہماری تحریک ہرگز خفیہ نہ تھی اور اس کی شہادت یہ

ہے کہ ہم نے باقاعدہ درخواست دی تھی کہ کسی اور پارٹی کی طرح ہمیں بھی قانونی حیثیت دی جائے۔ استغاثہ کی طرف سے "ثبوت" کے طور پر جعلی اشاعتوں کے چند نسخے پیش کیے گئے جنہیں ہم سے منسوب کیا گیا۔ یہ مقدمات تین سال تک چلتے رہے۔

حکومت کا خیال تھا کہ ہر مقدمے کے بعد تحریک بکھرتی جائے گی، مگر بار بار نئے گروپ اُبھر آتے جو تحریک کی رہنمائی کرنے لگتے۔ پہلی گرفتاریوں کے تین سال بعد تیونسی حکومت نے جانا کہ اسلامی تحریک کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے، اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، حتیٰ کہ جس رسالہ یا مجلّہ کو اپنے تمام نسخے فروخت کرنے ہوتے اسے بس اسلام پسندوں کے بارے میں ایک مضمون شائع کر دینا کافی ہوتا۔

جنوری ۱۹۸۴ء میں تیونسی حکومت ایک بڑے بحران کی زد میں آگئی۔ "روٹی کے بحران" نے حکومت اور اس کی سیاست کی نااہلی واضح کر دی، لہٰذا حکومت کو مجبوراً عوام کو کچھ مراعات دینی پڑیں۔ یوں ہم اللہ کریم کے فضل سے معافیٔ عام کے تحت رہا ہو گئے۔

سوال۔ بورقیبہ حکومت نے اسلام کے ساتھ جو رویہ اور طرزِ عمل روا رکھا اس کے متعلق مختصراً کچھ بتایئے گا؟

جواب: کیا عجیب معاملہ ہے کہ بورقیبہ جب فرانسیسی استعمار سے آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا تو اپنے خطابوں میں قرآن و حدیث سے کام لیتا تھا اور مسجدوں میں خطبے دیتا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں اُس نے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اُن عورتوں کی مذمت کی جو گھر سے بلا حجاب نکل آتی تھیں۔ مگر جب ۱۹۵۷ء میں برسرِ اقتدار تھا تو اُس نے حجاب اوڑھنے پر پابندی لگا دی، اور ایک مرتبہ تو اُس نے بر تماشا کیا کہ ایک عورت کا نقاب نوچ کر پھاڑ ڈالا۔ بعد ازاں ۱۹۸۱ء میں ایک قانون منظور ہوا جس کی رُو سے سرکاری دفاتر میں ملازم یا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخلہ لینے والی خواتین کا پردے میں رہنا ممنوع قرار دیا گیا۔

پھر ۱۹۵۹ء میں اُس نے تعددِ ازدواج کو ممنوع قرار دیا۔ اور یہ دیوانی قوانین آج تک نافذ ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں بورقیبہ نے رمضان میں روزے رکھنا ممنوع قرار دیا۔ اور عذر یہ کیا کہ یہ ملکی معیشت کے لیے نقصان رساں ہے، اور سارے اہلِ تیونس کو روزہ توڑنے کی دعوت کے طور پر علی الاعلان شراب پی ۱۹۷۴ء میں اُس نے دعویٰ کیا کہ قرآن میں تضادات ہیں، اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا مذاق اُڑایا۔

گو یہ صحیح ہے کہ بورقیبہ سے پہلے کے حکمران بھی شریعت کے پابند نہ تھے نہ اس پر عمل پیرا، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی نے اسلام کی تذلیل نہیں کی تھی۔ اور نہ مسلمانوں پر مخالفِ اسلام قوانین مسلط کیے تھے، خواہ وہ اندر سے سچے مومن بھی نہ ہوں۔ مگر بورقیبہ تو خلافِ اسلام جنگ کرنے اور تیونس میں مادہ پرست مغربی معاشرے کے تمام اقدار و اطوارِ حیات ٹھونسنے میں فعال رہا ہے۔

سوال: جب اسلام کے خلاف یہ سب کارروائیاں ہو رہی تھیں تو علمائے تیونس نے حکومت کے خلاف کوئی موقف اختیار نہ کیا؟

جواب: نام نہاد "آزادی" کی آمد کے وقت سے علما کی سیادت کمزور پڑ گئی تھی۔ اگر کوئی امام حکومت کے خلاف بولنے کی جرأت کرتا تو منصب سے معزول کر دیا جاتا۔ اور اس کا جینا دوبھر ہو جاتا۔

جب بورقیبہ نے رمضان میں روزے رکھنے کو ممنوع ٹھیرایا تو دو علماء نے علی الاعلان اس کی مخالفت کی ___ شیخ عبدالرحیم الحلیف اور شیخ الورطانی ___ دونوں کو تیس سال قید کی سزا دے دی گئی، گو بعد میں انہیں معافی مل گئی۔

۱۹۶۲ء میں علما کے ایک گروہ نے فوج کے ایک حصے کے اشتراک سے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ سازش پکڑی گئی اور دو علماء شیخ الرحمونی اور شیخ عبدالعزیز العقبی، جو اس میں شریک تھے، تختۂ دار پر چڑھا دیے گئے۔

سوال: اب تک ہم نے ماضی کی بات کی ہے۔ آئیے اب آئندہ سے نظر ملائیں۔ شمالی افریقہ اور خاص کر تیونس میں احیائے اسلام کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: "المغرب" میں جو نام نہاد آزادی کی تحریکیں استعماریوں سے لڑتے اٹھی تھیں، اب خود برسر اقتدار آ کر انہوں نے عوام سے دغا کی، جنہوں نے اسلام کی خاطر یہ جنگ لڑی تھی اور تب سے انہوں نے خود استعماریوں سے بھی بڑھ کر اسلام کو بے دست و پا کر دینے کی کوششیں جاری کر رکھی ہیں۔

آج ہمارے ملکوں میں جو مغرب زدہ خواص برسر اقتدار ہیں وہ صرف اس مختصر سی اقلیت کی نمائندگی کرتے ہیں جو مملکت فوج اور ذرائع ابلاغ کی طاقت سے مسلم اہل ایمان کی آبادی پر زبردستی مسلط ہو گئی ہے۔ استعماریوں ہی نے ان کو تعلیم دی اور انہی سے انہوں نے اقتدار کا ورثہ پایا۔

اب آئندہ کے خواص، جو اسلامی تیونس پر حکمرانی کریں گے، وہ نئی نسل ہے جو اس وقت زیرِ عتاب ہے۔ انشاء اللہ یہی اِس سرزمین میں اسلام کو پھر سے نافذ کریں گے۔

سوال: تیونس کی معیشت مبنی ہے سیاحت کی آمدنی پر، اور فرانس میں جا بسنے والوں کی ارسال کردہ رقوم پر۔ اور انہی دونوں نے ملک کے اخلاقی زوال اور اسلامی شعائر سے بے توجہی پھیلانے میں زبردست حصہ لیا ہے۔ لیکن اگر انہی دو ذرائع سے ملک محروم ہو جائے تو اس کی معیشت کا کیا حشر ہوگا؟

جواب: کسی قوم کی دولت تو اس کے عوام کی اپنی محنت کا ثمرہ ہونا چاہیے۔ مگر بورقیبہ حکومت نے جو آدمی بنایا ہے وہ منتظر رہتا ہے کہ کہیں اور سے فوائد آکر اُسے مل جائیں، یہی کچھ سیاحت اور یہ دلیس جا بسنے سے ہو رہا ہے۔ "بورقیبائی آدمی" تو وہ اللّے تللّے کرنے والا شخص ہے جسے سنجیدگی چھو نہیں گئی۔ ہمارے ملک کی معیشت کی اساس تب ہی بدلے گی جب تیونس کا آدمی زندگی کو متاعِ عزیز سمجھنے لگے اور جب اللہ کی راہ میں اپنی کوششوں کی قدر جانے اور اجر بعد الموت پر ایمان لائے۔

کسی ملک کی معاشی ترقی مشکل بات ہے اور محنت اور سعیِ مسلسل چاہتی ہے۔ ماضی میں تیونیسیہ اصلاً زرعی ملک تھا، مگر اب قوم کی عمومی آمدنی (G.D.P.) میں زراعت کا حصہ صرف ۱۵ تا ۱۸ فیصد ہے۔ تیونیسیا کو رومن "یورپ کا کھتّا" کہتے تھے، اور آج نصف سے زائد غذا درآمد کی جاتی ہے۔ فرانسیسیوں نے زیتون کے درخت اُکھاڑ کر تاکستان لگائے ـــــ سو آج تیونیسیا ایک بڑا شراب ساز ملک ہو گیا ہے۔ ملک کی معیشت کی بنیاد، یورپ پر کلّی انحصار پر رکھی گئی ہے۔ یورپ میں جب بھی کبھی کوئی معاشی بحران پیدا ہوتا ہے، تیونسی معیشت اس سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ انحصار غلط بات ہے، خدمات اور مال کے باہم مبادلے کے فطری تعلقات تو اسلامی اور عرب دُنیا اور افریقہ سے ہونے چاہییں۔